© rasailojaraid.com

مجیب الرحمٰن شامی

کھدر کی گٹھڑی میں ریشمی رومال

علامہ شبیر احمد بخاری نے پروفیسر مرزا محمد منور سے مخاطب ہو کر کہا، یہ شخص جو ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا ہے، پڑھا زیادہ اور لکھا کم تھا۔ اس نے جو کچھ لکھا، اس سے بہت زیادہ پڑھا۔ ایک لفظ لکھنے کے لیے ہزاروں الفاظ پڑھ لیے ہوں گے۔ لیکن اب دانش ور لکھتے زیادہ اور پڑھتے کم ہیں۔ ذرا اوپر سانس لینے کو رُکے اور کچھ یاد کرتے ہوئے بولے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے جہاں رکاوٹ پیدا ہوئی، وہاں مرحوم نے انگلی پکڑی۔ کسی مشکل کا ذکر کیا، فوراً کئی کتابوں کے نام بتا دیے، ان کے بعض حصّوں کی نشان دہی بھی کر دی کہ ان سے استفادہ کرکے دیکھیے، شاید الجھن رفع ہو جائے۔ یہ ہے رہنمائی، یہ ہے استادانہ مہارت، مرزا منور صاحب تصدیق میں سر ہلا رہے تھے کہ کلمہ شہادت بلند ہوا۔ مولانا محمد حنیف ندوی اپنے مکان سے باہر تشریف لا چکے تھے۔ چپ چاپ، چارپائی پر آرام فرما۔ یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا۔

مولانا محمد حنیف ندوی چپ چاپ اپنا کام کرتے رہے۔ جو کچھ بولا، ان کا کام ہی بولا۔ اُنھوں نے شور نہ مچایا۔ وہ ہنگامے اُٹھانا نہیں جانتے تھے، نہ اُنھیں آسمان سر پر اُٹھانے کا شوق تھا۔ وہ کتاب اور قلم کے آدمی تھے، اُنھی کے ساتھ رہے۔ گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے، مولانا اسماعیل سلفی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر ندوہ روانہ ہو گئے۔ مولانا سلفی نے اپنے ذہین شاگرد کو سید سلیمان ندوی کے سپرد کر دیا۔ وہاں ذہانت اور نکتہ رسی کا سکہ بٹھایا۔ فارغ التحصیل ہو چکے تو استاد نے خواہش ظاہر کی کہ ندوے والے لائبریریوں کے ہو کر رہ گئے ہیں، آپ میں تقریر کا جوہر ہے، اس میدان میں جم جائیے، سو خطابت اور امامت سے تعلق جوڑ لیا۔ خطیب پائے کے تھے، لیکن بے معنی الفاظ کے نقش بنانا نہیں آتا تھا۔ ہر لفظ کو اچھی طرح تولتے، تب زبان پر لاتے، اس میں معنی کا سمندر نہیں تو کوزہ بہر حال بند کرتے۔ لوگوں کو سوچنے اور سمجھنے کی طرف مائل کرتے۔ جذبات کو ابھارنے کی نہیں، خیالات کو سنوارنے کی کوشش کرتے۔

لاہور کی مسجدِ مبارک سے وابستہ ہوئے، یہاں جمعہ کا خطبہ دیتے رہے، درسِ قرآن کا حلقہ بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قائم کیا۔ مسجد کی انتظامیہ پچھتر روپے ماہانہ ان کی خدمت میں پیش کر دیتی۔ یہ بات ہے پاکستان بننے سے کئی سال پہلے کی۔ اس وقت مسلمانوں کے پاس مال و دولت کی فراوانی کہاں تھی۔ ایک ایک پیسہ جوڑ کر ضرورتوں کے پہاڑ سر کیے جاتے تھے۔ آج کی طرح تیل کے کنوئیں میں ڈبکی لگا کر نوٹ اکٹھا کرنے کا فن اس زمانے میں کسے آسکتا تھا؟ تیل نومن کیا نو چھٹانک بھی نہ تھا۔ عالم اسلام غلامی کی ذلتوں میں لت پت۔ اس وقت رادھا کہاں ناچتی اور کیسے ناچتی۔ پچھتر روپے اس طرح ملتے کہ کبھی پانچ روپے آگئے، کبھی دس روپے، کبھی دن گزر گئے۔ اور کبھی گزرے بغیر گزرتے رہے۔ ان کی چالیس سالہ رفاقت سے سرفراز، اسحاق بھٹی صاحب نے ان دنوں کی باتیں مولانا سے براہِ راست سنی ہوں گی۔ وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کی دوسری منزل پر واقع اپنے چھوٹے سے دفتر کی (قدرے) بڑی سی میز پر کہنی ٹکائے ماضی میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا، مولانا اس زمانے میں لاہور کی ایک بیرونی آبادی میں رہتے تھے۔ وہاں سے مسجد مبارک تک پہنچنے کے لیے ٹانگے میں ایک آنہ لگتا تھا۔ ایسا بھی ہوا کہ جیب میں ایک آنہ بھی نہ ہوا۔ پیدل مسجد تک آتے، درس قرآن دیتے اور پیدل واپس جاتے۔ کسی کو بتائے بغیر، کسی کی طرف دست سوال دراز کیے بغیر۔ ہاتھ اُنھوں نے عمر بھر سرہانے کے نیچے رکھا۔ کبھی کسی سے کچھ مانگتے نہ پائے گئے۔ رزاق دوجہاں کے خزانے سے جو مل گیا، شکر ادا کر کے وصول کر لیا۔

برسوں مسجد مبارک سے وابستہ رہے۔ پاکستان بنا تو حالات بدلے۔ نئے نمازی آئے، اُنھوں نے کراری تقریروں کے مزے چکھے تھے۔ علمی انداز کیوں بھاتا؟ وہ مولانا سے رنگ بدلنے کے تقاضے کرنے لگے۔ حریفوں کے بت بنانے اور پھر اُنھیں ڈھا کر بت شکن کہلانے کا فن نہ اُنھیں آتا تھا، نہ وہ اسے سیکھنے کے لیے تیار تھے۔ اُنھوں نے اس مسجد سے کنارہ کشی کر لی، اور مرکزی جمعیت اہلحدیث کی تعمیر میں لگ گئے۔ الاعتصام کی ادارت سنبھال لی۔ اسحاق بھٹی پہلے جمعیت کے آفس سیکرٹری اور پھر الاعتصام میں ”مدیر معاون، منیجر، کلرک، مدیر اور خاکروب“ سب کچھ مقرر ہوگئے۔ اس دن سے جوان کو دیکھنا شروع کیا تو اس ماہ جولائی تک دیکھتے رہے۔ حیرت ہے کہ اب تک ختم نہیں ہوتی۔ اچھا، ایسے لوگ اور ہم ایسوں کے درمیان!!!

ندوی صاحب کو خلیفہ عبدالحکیم نے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی۔ انھوں نے اُسے قبول کر لیا۔ خلیفہ صاحب نے تین سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ وہ اس سے پہلے ہی کام شروع کر چکے تھے۔ سراج منیر ڈائریکٹر مقرر ہوئے تو ان کی خدمت کو سعادت جانا۔ ایک دن اُنھیں جھاڑپونچھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر گھر سے اُٹھایا اور واپڈا آڈیٹوریم میں لا بٹھایا۔ ایک بڑی تقریب منعقد کی۔ کئی مقالے پڑھے گئے، اور ان کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔

ندوی صاحب کی کئی کتابیں چھپ کر منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ تفسیرِ قرآن تو انھوں نے جوانی ہی میں لکھ دی تھی۔ عربی زبان پر ان کو عبور تھا۔ قرآن کے سمندر میں غوطہ زن رہتے، تدبیر اور تدبر کے موتی ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے، وہ روشن خیال عالمِ دین سمجھے جاتے تھے۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں سے بچ کر اسلامی اقدار کے نفاذ پر زور دیتے تھے۔ وہ اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ دین کے تقاضوں کو سمجھنے اور ان کی تشریح و تعبیر کرنے کا حق صرف ماضی کو حاصل تھا۔ موجودہ عہد کے اس حق کے حق میں اُنھوں نے دلائل فراہم کیے۔ اسلام کے دریا کو کنواں (بلکہ جوہڑ) بنانے کی کوششوں کو رد کرتے رہے۔ ہاں ہر شخص کو مجتہد تسلیم کرنے اور "اجتہاد" کا نام لے کر نیا دین بنانے کے شوق کو بھی ان کے ہاں اذنِ رسائی نہ تھا۔

عجیب معاملہ ہے کہ خطیب کے طور پر زندگی کا آغاز کرنے والا، تحریر کا اس طرح ہوا کہ لوگ بھول گئے، یہ شخص بولتا بھی تھا۔ "ندویت" ان پر غالب آکر رہی۔ وہ لاہور میں ندوے کے سفیر تھے۔

دبلے پتلے، آہستہ چلنے والے اور میٹھے الفاظ بولنے والے اس شخص نے کسی کا راستہ نہیں کاٹا۔ کسی کو دھکا نہیں دیا۔ کسی کو پٹخنی نہیں دی۔ اطمینان اور سکون سے چلتے چلتے اناسی (۷۹) سال گزار دیے۔ کئی سال پہلے کا واقعہ ہے، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے دفتر میں کسی مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی اس میں شریک ہوئے۔ تقریب ختم ہوئی، مولانا واپس جانے کے لیے سٹیشن ویگن کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ باقی نشستیں ان کے رفقا نے سنبھال لیں۔

گاڑی سٹارٹ ہونے لگی تو مولانا نے دیکھا کہ ندوی صاحب کھڑے ہیں۔ فوراً نیچے اترے، ان کے پاس پہنچ کر پوچھا، آپ ہمارے ساتھ چلیں گے؟ ندوی صاحب نے جواب دیا آپ کے پاس جگہ ہے؟ یہ سُن کر مولانا نے ہنستے ہوئے پوچھا، "کھدر کی گٹھڑی میں ریشمی رومال کے لیے جگہ ہی کتنی درکار ہے؟"

یہ "ریشم کا رومال" اناسی (۷۹) سال اس دُنیا میں گزارنے کے بعد رخصت ہوا تو جنازہ کرائے کے مکان سے اُٹھا۔ ان کے دو صاحب زادے معذور ہیں۔ کہیں کہیں سے آواز اٹھی ہے کہ ان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پسماندگان کو حکومت سر چھپانے کی جگہ عطا کر دے ۔ اُمید کی جانی چاہیے کہ یہ آواز حکومت کے کانوں تک پہنچ جائے گی ۔ سیکرٹری اطلاعات ڈاکٹر صفدر محمود، پروفیسر محمد عثمان کی بیوہ اور پروفیسر وارث میر کے بچوں کے ساتھ مولانا ندوی مرحوم کے پسماندگان کی تصویر بھی وزیراعلیٰ میاں نواز شریف کو دکھا دیں گے ۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ مولانا کی زندگی میں (میرے سمیت) کسی کی نظر اس طرف نہیں گئی ۔ کوئی بتائے تو سہی کہ ہمیں آخر کس کی نظر لگ گئی ہے!!

(نوائے وقت ۔ ۲۷ جولائی ۱۹۸۷ء)

© rasailojaraid.com